© rasailojaraid.com

قرآن مجید میں مستعمل بعض مشترک الفاظ کی معنویت

نسیم ظہیر اصلاحی

عربی زبان میں مستعمل الفاظ اپنے معنی ومفہوم میں متفق یا مختلف ہونے کے اعتبار سے متعدد قسم کے ہوتے ہیں۔ان میں تین زیادہ مشہور ہیں:

الفاظ متباینہ: یعنی ایسے الفاظ جو اپنے معنی ومفہوم میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ایسے ہی الفاظ کی کثرت ہے جیسے جاء، ذھب، قام، قعد۔ان کا حصر واحصا ممکن نہیں۔

الفاظ مترادفہ: بعض وہ الفاظ جو ہیں تو مختلف ومتعدد لیکن ان کا بنیادی مفہوم و مدلول ایک ہی ہے۔جیسے جلوس و قعود یا اسد ولیث۔

الفاظ مشترکہ: یعنی لفظ تو ایک ہو مگر اس کی دلالت ایک سے زائد مختلف ومتعدد معانی پر ہوتی ہو۔جیسے لفظ ''عین'' اس کا اطلاق نگاہ پر بھی ہوتا ہے اور چمکتے سورج پر بھی۔گھنٹے کے لیے بھی بولا جاتا ہے اور سونا چاندی کے لیے بھی مستعمل ہے۔

قرآنی علوم سے بحث کرنے والے جدید وقدیم علماء نے موخر الذکر دونوں نوع کے الفاظ کو اپنی تصانیف کا موضوع بنایا ہے اور اپنی اس بحث کو ''وجوہ ونظائر'' کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔علامہ سیوطی لکھتے ہیں:

> ''متقدمین میں مقاتل بن سلیمان نے اس موضوع پر ایک کتاب تصنیف کی ہے اور متاخرین میں ابن الجوزی، ابن الدامغانی، ابوالحسین، محمد بن عبدالصمد مصری، ابن فارس اور دوسروں نے بھی خاص اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پس وجوہ ایسے لفظ مشترک کو کہتے ہیں جو متعدد معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے لفظ "امۃ" (جو جماعت، زمانہ، دین اور امام ومقتدی وغیرہ مختلف معانی کے لیے بولا جاتا ہے)

اور نظائر، الفاظ متواطئہ یعنی مترادفہ کو کہتے ہیں"۔[۲]

علمائے عربیت لفظ مشترک کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

"ھو اللفظ الواحد الدال علی معنیین مختلفین فاکثر دلالۃ علی السواء عند اھل تلک اللغۃ"۔[۳]

لیکن اہل زبان یا ان کے شعراء وخطباء یا انشا پرداز جب ایسے مشترک الفاظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد ان کا صرف کوئی ایک ہی معنی ہوتا ہے جو سیاق کلام سے متعلق ہوجاتا ہے۔ اور اگر دوسرا معنیٰ مراد لیا جائے تو پھر پہلے معنی کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ لیکن قرآن کریم کا یہ نہایت اہم اعجاز ہے کہ وہ ایسے بہت سے مشترک الفاظ، استعمال کرتا ہے اور ان کے مختلف ومتعدد معانی بیک وقت مراد بھی ہوتے ہیں یا مراد لیے جاسکتے ہیں اور کمال یہ ہے کہ آیت کے معنی ومفہوم میں نہ کوئی اختلاف واقع ہوتا ہے نہ کوئی اختلال۔ بلکہ اس سے آیت کے مفہوم ومدلول اور اس کی معنویت میں مزید وسعت وجامعیت اور زور وقوت پیدا ہوجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوالدرداءؓ نے فرمایا:

"لا یفقہ العبد کل الفقہ حتی یری للقرآن وجدھا کثیرا"۔[۴]

(کسی شخص کو کامل تفقہ حاصل نہیں ہوسکتا تا آنکہ وہ قرآن مجید کے وجوہ کثیر پر نظر نہ ڈال لے۔)

امام سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ بعض علماء نے اس قول کا یہ مفہوم بتایا ہے:

"آدمی اس لفظ واحد پر اچھی طرح غور کرلے جو اپنے اندر متعدد معانی رکھتا ہے۔ اگر کوئی تضاد نہ ہو تو اس لفظ کو ان تمام معانی پر محمول کرے اور اس کے کسی ایک ہی معنی پر اکتفا نہ کرے"۔[۵]

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہم یہاں کچھ ایسے قرآنی شواہد پیش کرنا چاہتے ہیں جن میں بعض ایسے مشترک الفاظ وارد ہوئے ہیں، جن کے تمام یا بعض معانی بغیر کسی تعارض واختلال کے مراد ہیں یا مراد لیے جانے کی ایسی گنجائش موجود ہے جس سے مفہومِ آیت انتہائی جامع اور وسیع وعمیق ہوجاتا ہے۔ ان مثالوں سے قرآن کریم کے ''جوامع الکلم'' ہونے کی ایک اور جہت سامنے آئے گی اور اس کا ایک اور نشان امتیاز اور اس کے اعجاز کا ایک دلکش سراغ ہاتھ آئے گا۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ فریضۃ

اس کی ایک مثال لفظ ''فریضۃ'' ہے جو آیت ذیل میں وارد ہے:

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۔ (توبہ/۶۰)

آیت میں مذکور لفظ ''فریضۃ'' فَرَضَ يَفْرِضُ فَرْضاً کا اسم ہے۔ اور لفظ 'فرض' کئی معنی کے لیے مستعمل ہے۔ ایجاب والزام اس کا بہت عام اور مشہور معنی ہے[۶]۔ فرض کا معنی ہبہ اور عطیہ موسومہ کے بھی ہیں[۷]۔ ''فرض له في العطاء فرضا'' یعنی عطیہ میں ایک متعین حصہ واجب ولازم قرار دیا[۸]۔

لفظ 'فرض' کا اصلی معنی کسی سخت چیز کو کاٹنا، اس میں شگاف لگانا اور اثر ڈالنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے واجب کردہ فرض کا نام، فرض، اس لیے پڑا کہ وہ آدمی پر اس طرح واجب ولازم ہوتا ہے جس طرح کسی چیز میں ٹوٹ پھوٹ، شگاف اور نشان کا پڑنا لازم ہے[۹] نیز لفظ فرض میں ''تقدیر'' یعنی مقدار متعین کرنے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ ازہری کا بیان ہے:

''الفرض مصدر كل شيء تفرضه فتوجبه على انسان بقدر معلوم والاسم الفريضة''[۱۰]

اس سے معلوم ہوا کہ لفظ ''فریضہ'' واجب کردہ فرض اور متعین ومقرر کردہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حصہ، دونوں معنی پر مشتمل، مشترک لفظ ہے اور قرآن مجید میں اس لفظ مشترک کا استعمال بالعموم اس کے دونوں ہی معنی ''ایجاب وتقدیر'' کے لیے ایک ساتھ ہوا ہے۔ آیت مذکور کا یہ لفظ اس کی واضح مثال ہے۔ چنانچہ علامہ طبری اس کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''فریضۃ من اللہ'' یقول جل ثنائہ: قسم قسمہ اللہ لھم فاوجبہ فی اموال اھل الاموال لھم''[۱۱]

یعنی صدقات ایک متعین حصہ ہیں جو اللہ تعالیٰ نے فقراء و مساکین کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ پھر اس کو اہل ثروت کے اموال میں ان مستحقین کے لیے واجب بھی قرار دے دیا ہے۔

ابن عطیہ لکھتے ہیں:

''فریضۃ من اللہ ای موجبۃ محدودۃ''[۱۲]

(یعنی صدقات منجانب اللہ واجب اور متعین مقدار میں ہیں۔)

بعض مفسرین نے یوں تفسیر کی ہے:

''فریضۃ من اللہ'' فرضھا وقدرھا''[۱۳]

(یعنی اللہ ہی نے صدقہ کو فرض و واجب بھی قرار دیا اور اس کی مقدار بھی متعین کر دی۔)

غور کیجیے لفظ 'فریضہ' کے دو معنی ہیں اور دونوں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مگر قرآن نے اس کو اس خوبی سے استعمال کیا کہ وہ دونوں مختلف معنی ایک ساتھ مطلوب ہو گئے۔ اگر کوئی ایک معنی نظر انداز کر دیا جائے تو بات ادھوری اور ناقص رہ جائے گی۔ کیا کوئی دوسرا لفظ اس کی جگہ آ کر آیت کو اس وسعت و جامعیت سے ہمکنار کر سکتا ہے، جو اس فصیح و بلیغ ذو معنی لفظ نے اس کے اندر سمو دیا ہے؟

۲- نحلۃ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وَآتُوا النِّسَاء صَدُقَاتِهِنَّ نِحْلَةً۔ (نساء/۴)

اس آیت میں خطاب شوہروں سے ہے جیسا کہ عام مفسرین کا خیال ہے۔ یا عورتوں کے اولیاء سے ہے اس لیے کہ دور جاہلیت میں ولی عورتوں کا مہر خود لے لیتا تھا ان کو کچھ نہ دیتا تھا۔ بعض لوگوں کے نزدیک خطاب ان متشاغرین سے ہے جو کسی سے اپنی بہن یا بیٹی کا نکاح بغیر کسی مہر کے اس شرط پر کردیا کرتے تھے کہ وہ بھی اپنی بہن یا بیٹی کا نکاح، اس کے ساتھ بغیر کسی مہر کے کردے گا ۱۴۔

ممکن ہے خطاب مذکورہ تمام لوگوں سے ہو۔ لیکن پہلا قول زیادہ صحیح اس لیے معلوم ہوتا ہے کہ سابقہ تمام ضمیریں ایک ہی ہیں اور سب ازواج کی طرف لوٹ رہی ہیں۔ لیکن یہاں اصل مسئلہ یہ ہے کہ "نحلة" سے مراد کیا ہے؟ حضرت ابن عباسؓ کا خیال ہے کہ اس سے مراد مہر ہی ہے یعنی بالنحلة المہر ۱۵۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: نحلة فریضة ۱۶۔

ابن زید کہتے ہیں کہ نحلة، کلام عرب میں 'واجب' کو کہتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ آیت کا منشا یہ ہے کہ عورتوں سے کسی شیَٔ واجب کے بدلے نکاح کرو۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی عورت سے بغیر "مہر واجب" کے نکاح کرے ۱۷۔

مقاتل بن حیان، قتادہ، اور ابن جریج کے نزدیک "نحلة" "فریضة" کے معنی میں ہے۔ ابن جریج نے اس کے ساتھ لفظ مسماة کا اضافہ کیا ہے، یعنی "فریضة مسماة معلوم المقدار حصہ ۱۸۔

کلبی اور فراء کے نزدیک "نحلة" عطیہ اور ھبہ کے معنی میں ہے ۱۹۔

ابو عبیدہ کا کہنا ہے کہ "نحلة" عن طیب نفس، یعنی خوش دلی اور آمادگیٔ نفس کے مفہوم میں ہے ۲۰۔ یعنی مہر خوش دلی اور بطیبِ خاطر ادا کرو۔

زجاج نے بعض علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ "نحلة" سے مراد "دیانة" یعنی دینی عبادت ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ مہر عبادت اور دینی حکم سمجھ کر ادا کرو ۲۱۔

لفظ "نحلة" کے یہ وہ مختلف معانی ہیں جو ہمارے مفسرین نے بیان فرمائے ہیں۔ اور حضرت ابن عباسؓ کے قول کو چھوڑ کر ان پر نظر ڈالی جائے تو یہ کل پانچ معانی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتے ہیں:

واجبہ، فریضہ، ہبہ، دیانت، عن طیب نفس

اور یہ تمام معانی کسی نہ کسی طرح ان معانی کے ذیل میں آ جاتے ہیں، جن میں اہل عرب نے اس لفظ کو استعمال کیا ہے۲۲۔

اب سوال یہ ہے کہ اس متکثر المعنی لفظ کو آیت مذکور میں استعمال کرنے کے پیچھے کیا راز اور حکمت کارفرما ہے؟

چونکہ قرآن کریم کا بڑا مقصد لوگوں کی ہدایت و رہنمائی، ان کے علائق و معاشرت کی اصلاح اور عادات و اخلاق کی درستگی ہے۔ دوسری طرف آیت زیرِ بحث کا مقصود و منشا عورت کو دور جاہلیت کے ظلم و تعدی سے نجات دلانا ہے اور اس سے متعلق یہ بات ہے کہ مہر عورت کا لازمی حق ہے۔ اس میں کسی طرح سے کمی کرنا حرام ہے۔ اور اس حق کا احترام کرنا حسن معاشرت کے اسباب میں سے ہے۔ اس لیے اس بلند مقصد کے حصول کے لیے یہ جامع لفظ اختیار کیا گیا تا کہ بغیر کسی تعارض کے بہت سے معانی کا احاطہ ہو جائے اور سیاق کلام بھی ہم آہنگ رہے۔

چنانچہ لفظ "نحلة" کو مذکورہ پانچوں معانی پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کی معنویت و جامعیت جاننے کے لیے اس کی ترکیبی حیثیت پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ترکیبی اعتبار سے یہاں لفظ "نحلة" کی دو نوعیتیں ہو سکتی ہیں: ۲۳

۱- ایک یہ کہ وہ ہے تو مصدر مگر حال کے موضع و محل میں ہے اور ذوالحال مخاطبین ہیں، یعنی حال کونکم ناحلین یا صدقات سے حال مانا جائے اور تقدیر کلام یوں ہو حال کونها منحولة، یا یہ مانا جائے کہ یہ لفظ هن ضمیر سے حال پڑا ہوا ہے حال کونهن منحولات۔

اس صورت میں آیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ "ان کا مہر دو اس حال میں کہ تمہارے دل اس سے راضی ہیں، وہ ایک فرض عبادت اور معلوم المقدار ہیں۔ ان عورتوں کے لیے اللہ کا عطیہ اور ہبہ ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۲- دوسرے یہ کہ آتــوا فعل کا مفعول مطلق قرار دیا جائے اس سے بیان نوع مراد لیا جائے یعنی ایتاء کی نوعیت "نحلة" ہے۔ اس صورت میں آیت کا معنی ہوگا:

''عورتوں کو ان کا مہر ادا کرو ایک فرضی عبادت کی طرح، دل کی آمادگی کے ساتھ معلوم و مقرر حصہ دینے کی طرح اور اس طرح کہ وہ ان کے لیے اللہ کا عطیہ اور ہبہ ہیں۔''

۳- عتیق

سورۃ الحج میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ۔ (الحج/۲۹)

آیت میں مذکور لفظ "عتیق" الفاظ مشترکہ میں سے ہے اور 'عتق' سے ماخوذ ہے۔ اہل عرب کے یہاں قدامت، حریت، شرف و کرامت اور جمال و بہا پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔[۲۴] علمائے تفسیر کے اقوال بھی ان معانی سے الگ نہیں ہیں۔ اس تعلق سے ان کے تین اقوال پائے جاتے ہیں:[۲۵]

۱- ایک یہ کہ وہ ''مُعتَق'' یعنی آزاد کے معنی میں ہے اور وہ اس لیے کہ بیت اللہ جبابرۂ وقت کی گرفت سے ہمیشہ آزاد رہا ہے۔ کبھی اس پر کسی کا قبضہ و تسلط نہیں رہا اور بعض لوگوں نے کہا کہ طوفان نوح میں غرق و انہدام سے آزاد و محفوظ رہا۔

اس پہلے قول کی تائید سنن نسائی کی اس روایت سے ہوتی ہے جو عبداللہ بن زبیرؓ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا: انما سمی البیت، العتیق لانه لم یظهر علیه جبار [۲۶] اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جن آیات کے ضمن میں یہ لفظ عتیق آیا ہے، ان کے بنیادی موضوع سے یہ مفہوم بڑی مناسبت رکھتا ہے۔ اس لیے کہ اس سے مشرکین کے لیے ایک تعریض نکلتی ہے۔ وہ بہت سے لوگوں کو بیت اللہ سے دور رکھتے تھے اور جس کو چاہتے تھے اس سے روک دیتے تھے۔ حتی کہ اس کا دروازہ بغیر کسی زینہ کے بہت اونچا بنایا تھا تا کہ اس میں وہی شخص داخل ہو سکے جسے وہ چاہیں۔ جیسا کہ صحیحین میں حضرت عائشہؓ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے مروی ہے ۲۷۔

دوسرے یہ کہ لفظ "عتیق" کا معنی قدیم کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ قول اس پر دلیل ہے:

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعٰلَمِينَ۔ (آل عمران/۹۶)

تیسرے یہ کہ اس کا معنی ہے، شریف وکریم اور فضل وکمال والا۔

آیت کے اندرونی ماحول پر نگاہ ڈالی جائے تو ظاہر ہوگا کہ اس لفظ مشترک کو اس کے مذکورہ تمام معانی پر محمول کرنا ہی بہتر ہے۔ اور یہی قرآنی بلاغت اور اس کے اعجاز کے شایان شان ہے کیونکہ اس وصف سے آیت کا مقصود، اس گھر کی عظمت و رفعت اجاگر کرنا ہے جس کا طواف حج جیسی مہتم بالشان عبادت کا اہم رکن ہے۔ چنانچہ اس کے لیے ایسا جامع لفظ منتخب کیا گیا کہ کوئی دوسرا لفظ اس کی قائم مقامی نہیں کرسکتا۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ لفظ عتیق نے ان تمام عظمت وفضیلت اور اوصاف کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے جو بیت اللہ شریف کو حاصل ہیں۔ اس کے مذکورہ معانی پیش نظر رکھیے تو آیت کا یہ مفہوم بنے گا "اس بیت اللہ کا طواف کرو، وہ روئے زمین پر سب سے قدیم اور اشرف واکرم ہے، جو جابروں اور زور آوروں کے تسلط سے ہمیشہ محفوظ رہا۔ اس لیے کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کے لیے بنایا ہے۔ چنانچہ بعض مفسرین نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے:

القديم افضل المساجد على الاطلاق المعتق من تسلط الجبابرة ۲۸۔

بیت عتیق یعنی ایسا قدیم گھر جو علی الاطلاق تمام مساجد سے افضل و برتر ہے، شہ زوروں کے وسعت تسلط سے آزاد ہے۔

اگر آپ عربی زبان پر غور کریں اور اس کے تمام الفاظ کھنگال ڈالیں تو بھی اس کے جیسا فصیح و بلیغ اور جامع لفظ نہ پاسکیں گے۔ یہ کلام اللہ ہی کا کمال و اعجاز ہے کہ وہ مختلف معانی کا حامل لفظ استعمال کرتا ہے اور وہ معانی مختلفہ بیک وقت مراد بھی لیے جاسکتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں۔ لیکن اس سے مفہوم میں نہ کوئی اختلاف واقع ہوتا ہے نہ اقتضاب بلکہ اس کی جامعیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ سچ فرمایا رب کریم وحکیم نے: وَلَوْ كَانَ مِنْ عِندِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا (النساء/۸۲)

۴۔ امۃ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے سورہ نحل میں "امۃ" کہا ہے:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتاً لِلّٰهِ حَنِيفاً وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (النحل/۱۲۰)

لفظ "امۃ" عربی زبان کا مشترک لفظ ہے اور اس کے متعدد معنی ہوتے ہیں ۲۹۔ ایک معنی لوگوں کی جماعت اور گروہ کے ہیں۔ قرآن میں بھی یہ لفظ اس معنی میں آیا ہے: وَجَدَ عَلَيْهِ أُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُونَ (القصص/۲۳)

دین کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ہے إِنَّا وَجَدْنَا آبَاءَنَا عَلَى أُمَّةٍ وَإِنَّا عَلَى آثَارِهِم مُّهْتَدُونَ (الزخرف/۲۲) تھوڑی مدت، وقت اور زمانہ کے لیے بھی اس کا استعمال ہے مثلاً قرآن کہتا ہے وَادَّكَرَ بَعْدَ أُمَّةٍ (یوسف/۴۵)۔

نعمت اور خیر بھی اس کا ایک معنی ہے۔ قد و قامت کے لیے بھی یہ لفظ مستعمل ہے۔ کہتے ہیں رجل حسن الامۃ۔ اچھے قد و قامت کا آدمی۔

امام و پیشوا اور مقتدیٰ کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسا کہ زیر بحث مذکورۃ الصدر آیت میں ہے۔

سورہ نحل میں مذکورہ آیت میں وارد لفظ "امۃ" کے تعلق سے اہل تفسیر مختلف الرائے ہیں کہ یہاں اس کو کس معنی میں لیا جائے؟ ایک قول تو یہی ہے، اور زیادہ مشہور بھی ہے کہ وہ معلم، امام و رہنما اور مقتدی فی الخیر کے معنی میں ہے۔ اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہی شان تھی۔ خود اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَاماً (البقرہ/۱۲۴) یہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دوسری تفسیر اس کی یہ کی جاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی ذات میں تنہا ایک امت تھے۔ یعنی دعوتی جدوجہد، اصلاحی کدوکاوش، ذاتی اخلاق وکردار اور ایثار وقربانی کے ایسے اوصاف عالیہ اور خصال حمیدہ سے متصف تھے کہ وہ کسی گروہ اور جماعت میں من حیث المجموع تو پائے جاسکتے ہیں۔ لیکن کسی فرد واحد میں ان سب کا جمع ہونا بالعموم ممکن نہیں۔ گویا حضرت ابراہیمؑ اپنی ذات میں ایک انجمن یا ادارہ تھے۔

تیسرا مفہوم اس کا یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ تنہا توحید خالص پر تھے باقی لوگ کفر و شرک میں مبتلا تھے۔ یہ مجاہد کا قول ہے۔ جیسا کہ سورہ بقرہ (آیت-۲۱۳) میں ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (سب لوگ ایک ہی دین، دین توحید پر تھے)۳۰۔ حضرت ابن عباسؓ اور بعض دوسرے حضرات کی یہی رائے ہے۔

چونکہ یہ موقع حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عظمت واہمیت کے اظہار اور ان کی مدح وستائش کا ہے اس لیے زیادہ مناسب یہی ہے کہ یہاں لفظ امت کو اس کے ان تمام معانی پر محمول کیا جائے جو باہم متعارض نہیں ہیں۔ اور یہ معانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بیان احوال کے لیے زیادہ صحیح بھی ہوں گے۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوگا:

> ''حضرت ابراہیم ایک امت تھے یعنی توحید خالص کے حامل تھے۔ امام و رہنما اور مقتدی فی الخیر تھے ان کی ذات میں ایسے اوصاف وکمالات جمع تھے جو کسی گروہ وجماعت میں ہی پائے جاسکتے ہیں''۔

اس طرح اس لفظ کی تفسیر میں جو مختلف اقوال اختیار کیے گئے ہیں، ایک طرف وہ سب جمع ہوجاتے ہیں اور ان میں باہم توافق پیدا ہوجاتا ہے تو دوسری طرف اس لفظ جامع کے تعلق سے قرآنی اعجاز وبلاغت کا ایک پہلو بھی اجاگر ہوتا ہے۔

۵- عسعس

یہ لفظ سورہ تکویر میں استعمال ہوا ہے: وَاللَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ (۱۷) اہل لغت کے نزدیک اس کا شمار ''کلمات الاضداد''۳۱ میں ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ لفظ رات کی آمد اور اس کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

واپسی دونوں کے لیے مستعمل ہے۔ جیسا کہ مشہور ماہرین عربیت قطرب، خلیل، مبرد اور ابوعبیدہ وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے۳۲۔

زجاج کا بیان ہے:

یقال عسعس اللیل اذا اقبل وعسعس اذا ادبر و المعنان یرجعان إلی شئ واحد وھو ابتداء الظلام فی اولہ وادبارہ فی آخرہ ۳۳

عسعس اللیل رات کی آمد پر بھی بولا جاتا ہے اور اس کی واپسی پر بھی۔ دونوں معانی کا حاصل ایک ہی ہے۔ یعنی رات کی تاریکی جو آغاز شب سے شروع ہوکر اس کے اختتام پر ختم ہوتی ہے۔

ان کا مطلب شاید یہ ہے کہ **عسعس** کا تعلق رات کی اس تاریکی سے ہے جو معمولی اور غیر مستحکم ہوتی ہے اور رات کے اول و آخر میں رہتی ہے۔ اور یہ چونکہ ایک ہی حالت ہے اس لیے لفظ عسعس کا مسمی ایک ہی ہوا اسی لیے امام راغب اصفہانیؒ کہتے ہیں:

واللیل اذا عسعس: ای اقبل و ادبر، وذلک فی مبدأ اللیل ومنتھاہ، فالعسعسۃ والعساس رقۃ الظلام و ذلک فی طرفی اللیل ۳۴۔

یعنی **واللیل اذا عسعس** کا معنی ہے رات کا آنا اور اس کا جانا اور یہ اس کی ابتدا و انتہا کے وقت کا عمل ہے اس لیے عسعسہ اور عساس ہلکی تاریکی کو کہیں گے اور یہ رات کے دونوں اطراف ہی میں ہوتی ہے۔

رہے ہمارے مفسرین تو ان کی دو الگ الگ رائیں ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ کے ایک قول کے مطابق **وَالَّیۡلِ إِذَا عَسۡعَسَ** کا معنی ہے **اذا ادبر** یعنی رات کا جانا۔ یہی خیال حضرت علیؓ، مجاہد، قتادہ، ضحاک، زید بن اسلم اور ان کے صاحبزادے عبدالرحمٰن کا بھی ہے۔ علامہ ابن جریر طبری نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ اس لیے کہ اس کے بعد **والصبح اذا تنفس** ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ قسم رخصت پذیر شب اور نمودار ہوئے دن کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھائی گئی ہے ۳۵۔

ایک دوسرے قول کے مطابق حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک **واللیل اذا عسعس، اذا اقبل** کے معنی میں ہے یعنی رات کا آنا۔ یہی حضرت حسنؒ اور حضرت سعید بن جبیرؒ کی رائے ہے ۳۶۔ اسی کو ابن کثیر نے اختیار کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> **"کانہ اقسم باللیل وظلامہ اذا اقبل وبالفجر وضیائہ اذا اشرق. کما قال تعالیٰ والیل اذا یغشی والنہار اذا تجلی** (واللیل ۹۲/۱-۲) **وقال تعالیٰ والضحیٰ واللیل اذا سجی"** (الضحیٰ ۹۳/۱-۲) ۳۷۔

یعنی رات اور اس کی تاریکی کی قسم کھائی گئی ہے جب وہ آئے اور صبح اور اس کی روشنی کی قسم کھائی گئی ہے جب وہ روشن ہوجائے۔ جیسے فرمایا گیا: **واللیل اذا یغشی والنہار اذا تجلی**۔ یا فرمایا: **والضحیٰ واللیل اذا سجی**۔

بلاشبہ علامہ طبریؒ کا نظم کلام کی بنیاد پر ادبار لیل کو ترجیح دینا ایک نہایت مضبوط اور وجیہ بات ہے۔ لیکن ابن کثیرؒ کا قرآنی نظائر وشواہد سے استدلال کرکے اقبال لیل کو راجح قرار دینا بھی کم وجیہ وقوی نہیں ہے بلکہ ترجیح کا یہی مضبوط طریقہ ہے۔ مگر ہمارے لیے دلچسپی کی چیز یہ ہے کہ کیا ان دونوں اقوال کے مابین جمع وتوفیق ممکن ہے اور کیا اس لفظ مشترک کو اس کے دونوں معنوں پر محمول کیا جاسکتا ہے؟

ہمارے خیال میں اس کے دونوں معنی ایک ساتھ مراد لینا ممکن ہے۔ ائمہ لغت، خلیل مبرد، زجاج اور امام راغب وغیرہ نے اس تعلق سے جو کچھ فرمایا ہے، اس سے ہماری تائید ہوتی ہے۔ پس آیت کا مفہوم یہ ہوگا:

> "قسم ہے رات کی جب وہ آئے اور جائے، اسی طرح قسم ہے صبح کی جب وہ آئے اور روشن ہوجائے"۔ یعنی تاریکی اور روشنی کی۔

بعض ائمہ تفسیر نے بھی اس معنی کو ترجیح دی ہے۔ مثلاً بیضاوی، ابوالسعود اور آلوسی ۳۸۔ ابن کثیر کا بھی کچھ اسی طرف میلان ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قال كثير من علماء الاصول: إن لفظة "عسعس" تستعمل في الاقبال والادبار علی وجه الاشتراک فعلی هذا يصح ان يراد کل منهما۳۹۔

بہت سے علمائے اصول فرماتے ہیں کہ لفظ عسعس بشکل اشتراک، اقبال و ادبار دونوں معنی کے لیے مستعمل ہے۔ اس بنا پر بیک وقت دونوں معنی اقبال وادبار مراد لینا صحیح ہوگا۔

۶ – أمرنا

یہ لفظ آیت ذیل میں وارد ہے:

إِذَا أَرَدْنَا أَن نُّهْلِكَ قَرْيَةً أَمَرْنَا مُتْرَفِيهَا فَفَسَقُواْ فِيهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنَاهَا تَدْمِيراً (بنی اسرائیل/۱۶)

فعل "أمر" مشترک لفظ ہے۔ اہل لغت نے اس کے کئی معنی بتائے ہیں ان میں سے ایک معنی ہے، امر وحکم (نقيض النهي) اور یہی زیادہ مشہور ومعروف اور کثیر الاستعمال ہے۔

ایک دوسرا معنی ہے، بڑھانا زیادہ کرنا۔ ابوعبید نے کہا آمرته، ہمزہ کے مد کے ساتھ اور أمرته، بغیر مد کے، دولغت ہیں، کثّرته بڑھانے اور زیادہ کرنے کے معنی میں۔ ابوزید نے کہا "مهرة مامورة" بولا جاتا ہے، اس کے لیے جو کثیر النسل ہو۔ بہت بچے والے کے لیے عرب بولتے ہیں "امر الله المهرة"، یعنی اس کو کثیر الاولاد بنایا۔

تیسرا معنی ہے، مسلط کرنا، امیر وحاکم بنانا۴۰۔

یوں تو اس کے اور بھی معنی ہیں مگر انہی تین معانی کے ذریعہ مذکورہ آیت کے لفظ "امرنا" کی تفسیر کی گئی ہے۴۱۔

پس پہلے معنی کے اعتبار سے حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: امرنا مترفيها قال: بطاعة الله فعصوا۔ یعنی اطاعت الٰہی کا حکم ہوا مگر انھوں نے نافرمانی کی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابن عباسؓ ہی سے اس کی ایک تفسیر یوں منقول ہے امرنا مترفیھا بحق فخالفوہ فحق علیھم بذلک التدمیر۔ ''ان کو راہ حق اختیار کرنے کا حکم ہوا مگر انھوں نے اس کی مخالفت کی پس ان کی ہلاکت لازم ہوگئی'' یہی تفسیر حضرت سعید بن جبیرؒ سے بھی مروی ہے۔

دوسرے معنی کے مطابق حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تفسیر میں فرمایا: اکثرنا عددھم، یعنی ہم نے ان کی تعداد بہت زیادہ بڑھادی۔ یہی عکرمہ، حسن، ضحاک اور قتادہ وغیرہ کی رائے ہے۔

تیسرے معنی کے لحاظ سے حضرت ابن عباسؓ نے اس کی یوں تفسیر بیان کی: سلطنا اشرارھا فعصوا فیھا فاذا فعلوا ذلک اھلکتھم بالعذاب۔ ''یعنی ان کے اشرار کو ان پر مسلط کردیا تو انھوں نے شرارت وعصیان کا رویہ اختیار کیا اور جب انھوں نے ایسا کیا تو ہم نے ان کو عذاب بھیج کر ہلاک کردیا''۔ جیسا کہ آیت ذیل میں ہے:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِیْ كُلِّ قَرْيَةٍ أَكَابِرَ مُجْرِمِيْهَا لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا۔ (الانعام/۱۲۳)

ابوالعالیہ، مجاہد اور ربیع بن انس اسی تیسرے قول کے قائل ہیں۔

جو شخص آیت کے سیاق وسباق پر نظر ڈالے گا اور ان تینوں معانی پر غور کرے گا جن پر یہ لفظ مشترک دلالت کررہا ہے اور یہ دیکھے گا کہ یہ معانی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ان کی تینوں تفسیر سے مطابقت رکھتے ہیں تو اس کی نظر اس حقیقت پر ٹکے گی کہ ان تینوں معنی کا یہاں جمع ہوجانا عین ممکن ہے۔ چنانچہ ماقبل سے ربط وتعلق استوار رکھتے ہوئے آیت کا معنی ہوگا:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے ظلم وجور حرام قرار دے رکھا ہے اور یہ فیصلہ کرچکا ہے کہ کس بستی پر اس وقت عذاب بھیجے گا، جس اس کے باشندوں پر اس طرح حجت قائم کردے کہ ان کے پاس رسول بھیج کر ان کو نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے اور پھر اتمام حجت کے بعد جب اللہ ان کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہلاکت کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے لیے اسباب پیدا کرتا ہے، وہ اس طرح کہ ان کے مترفین کی تعداد بڑھا دیتا ہے یہاں تک کہ ان کو غلبہ و تسلط حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر فسق و فجور اور احکام خداوندی کی نافرمانی کثرت سے ہونے لگتی ہے پس ان کے لیے سنت اللہ کا ظہور واجب اور عذاب کا آنا حلال و جائز ہو جاتا ہے''۔

۷- اُتلُ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

اتْلُ مَا أُوحِيَ إِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ وَأَقِمِ الصَّلوٰةَ إِنَّ الصَّلوٰةَ تَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُونَ (العنکبوت/۴۵)

آیت میں مذکور لفظ ''اُتل'' تَلا کا فعل امر ہے اور تلا مشترک لفظ ہے۔ اس کے دو معنی ہیں۔ ایک قرأ، پڑھنا۔ دوسرے تبع، اتباع کرنا۔ پہلے معنی کی بنیاد پر فعل تلا کا معنی ہوگا: لکھی ہوئی چیز پڑھنا۔ یا محفوظ و یاد کی ہوئی چیز کو کسی کے سامنے (زبانی) پیش کرنا[۴۲]۔

قرآن مجید میں 'قـرأة' کے بالمقابل 'تلاوۃ' کا لفظ زیادہ استعمال ہوا ہے۔ اس لیے کہ فصاحت و بلاغت اس کے اندر زیادہ ہے۔ اس کے اندر حروف قرآن کی درستگی و اقامت اور اس کے حدود و احکام کی رعایت کا پہلو زیادہ ہے۔ مزید براں نبی ﷺ کے لیے اس لفظ کا استعمال اس لیے زیادہ موزوں ہے کہ آپ ﷺ امی تھے، لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اسی طرح جس قوم میں آپ ﷺ مبعوث ہوئے تھے یعنی اہل عرب، ان میں بھی امیت غالب تھی۔

اس لیے وہ ''تلاوت'' جس کا اس آیت میں آپ ﷺ کو حکم ہے وہ قرأت مجردہ نہیں ہے بلکہ اس کے دونوں معنی قرأۃ و اتباع، اس میں شامل ہیں۔ اس لیے کہ آیت کا مقصود قراءت قرآن، اس کی حفاظت، اس پر غور و تدبر، اس کے الفاظ کا تتبع اور اس کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

احکام و ہدایات کی اتباع پر مداومت کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل کرنا ہے۔ چنانچہ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں:

"اتل ما اوحی إلیک" تقربا إلی اللہ تعالیٰ بقراء تہ و تحفظا لألفاظہ واستکشافا لمعانیہ؛ فان القاری المتأمل قد ینکشف لہ بالتکرار مالم ینکشف لہ اول ما قرع سمعہ[۴۳]۔

"وحی الٰہی کی تلاوت کروتا کہ اس کی قرأت کے ذریعہ اللہ کا تقرب حاصل ہو۔ اس کے الفاظ کا تحفظ ہو اور (نئے نئے) معانی کا انکشاف ہو، اس لیے کہ غور و تدبر کرنے والے قاری پر بار بار پڑھنے سے ایسے معانی منکشف ہوتے ہیں جو پہلی بار پڑھنے سننے سے حاصل نہیں ہوتے"۔

ابوالسعود لکھتے ہیں:

"نبی پاک ﷺ کو مداومت کے ساتھ قرآن کی تلاوت اور تدبر و تحقیق کا حکم دینے کے لیے فرمایا: اتل ما اوحی الیک من الکتاب"[۴۴]۔

مفسر سعدی اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"تلاوت قرآن کا معنی ہے اتباع قرآن، اس کے اوامر و نواہی کو بجالا کر، اس کے منہیات سے اجتناب کر کے، اس کی رہنمائی سے استفادہ کر کے۔ اس کی باتوں کی تصدیق کر کے۔ اس کے معانی پر غو و تدبر کر کے اور اس کے الفاظ کی تلاوت کر کے پس اس کی مجرد تلاوت، لفظ کے معنی و مفہوم کا صرف ایک حصہ اور جز ہے۔ اور جب تلاوت کا یہ وسیع معنی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ قیام دین کا پورا وسیع مفہوم تلاوت قرآن کے تحت داخل ہے۔ اور بعد میں آنے والا جملہ "اقم الصلوٰۃ" عطف الخاص علی العام کے قبیل سے ہے۔ نماز کا فضل و شرف اور اس کے بہترین اثرات و نتائج اس ذکر خاص کا سبب ہیں"[۴۵]۔

سورہ بقرہ کی یہ آیت اس بات کی سب سے زیادہ واضح دلیل ہے کہ یہ لفظ معجز

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اپنے دونوں معنی قرأت واتباع پر محمول ہوگا۔ الَّذِیْنَ آتَیْنَاھُمُ الْکِتَابَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ أُوْلٰئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَمَن یَّکْفُرْ بِہٖ فَأُوْلٰئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (البقرہ/۱۲۱)

اس کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور کئی ایک مفسرین کہتے ہیں کہ 'یتلونہ حق تلاوتہ' کا مطلب ہے کہ اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھیں۔ اس کو اپنے موقع ومحل سے نہ ہٹائیں اور اس کی کامل اتباع کریں۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا بیان ہے:

"والذی نفسی بیدہ إن حق تلاوتہ ان یحل حلالہ و یحرم حرامہ ویقرأہ کما انزل اللہ ولا یحرف الکلم عن مواضعہ ولا یتأول منہ شیئا علی تاویلہ (وفی لفظ) قال: یتبعونہ حق اتباعہ"[۴۶]۔

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تلاوت قرآن کا حق یہ ہے کہ اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھا جائے اور جیسے اللہ کی طرف سے اس کا نزول ہوا ہے اسی طرح اس کو پڑھا جائے۔ کوئی کلمہ اس کی جگہ سے نہ ہٹایا جائے اور اس کی کسی چیز کی ایسی تاویل نہ کی جائے جو اس کی تاویل نہ ہو اور اس کی ایسی اتباع کی جائے جو اس کا حق ہے"۔

ایک دوسری روایت میں حضرت ابن عباسؓ سے بھی یہ آخری فقرہ ویتبعونہ حق اتباعہ منقول ہے[۴۷]۔

خطیب بغدادی نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے بھی ویتلونہ حق تلاوتہ کی تفسیر ویتبعونہ حق اتباعہ ایک ایسی سند سے نقل کی ہے جس میں بعض مجہول الحال رواۃ ہیں۔ علامہ ابن کثیرؒ نے اس کی سند پر کلام کرنے کے بعد فرمایا "الا ان معناہ صحیح"[۴۸]۔ یعنی یہ روایت گو سنداً صحیح نہیں ہے، مگر اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے صحیح ہے۔

گویا عبادلہٗ ثلاثہ ابن عمر، ابن مسعود اور ابن عباس تینوں صحابہ کرامؓ کے نزدیک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ تلاوتِ قرآن جس کا مذکورۃ الصدر آیت میں حکم ہے، دراصل اس کا معنی قرآن مجید کی کامل ومکمل اتباع ہے۔ فقط اس کے الفاظ وکلمات کی خواندگی مراد نہیں ہے۔

آیت ذیل میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کو اس وجہ سے موردالزام ٹھہرایا ہے کہ وہ اپنی کتاب کی محض تلاوت کرتے تھے اور اس کی اتباع سے پہلو تہی کرتے تھے:

وَمِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لاَ يَعْلَمُونَ الْكِتَابَ إِلاَّ أَمَانِيَّ وَإِنْ هُمْ إِلاَّ يَظُنُّونَ (البقرہ/۷۸)

لیکن یہ اسی وقت ہوگا جب اس میں مستعمل لفظ ''امانی'' کو تلاوت کے معنی میں لیا جائے جیسا کہ بعض مفسرین کا یہی خیال بھی ہے۴۹۔ لیکن راقم، ہیچمداں کے نزدیک ''امانی'' کو تلاوت کے معنی میں سمجھنا محل نظر ہے۔

۸- جٰھلین

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَإِذَا سَمِعُوا اللَّغْوَ أَعْرَضُوا عَنْهُ وَقَالُوا لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ سَلاَمٌ عَلَيْكُمْ لاَ نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (القصص/۵۵)

آیت کا آخری جملہ 'لا نبتغی الجٰھلین' اعراض اور کنارہ کشی کی علت ہے۔ یعنی ہم ان لوگوں سے میل جول رکھنا پسند نہیں کرتے جو اللہ اور اس کے دین حق سے نابلد ہیں اور یہ جہل کا پہلا معنی ہوا، اس لیے کہ 'جہل' علم کی نقیض ہے۔

مذکورہ جملہ کا دوسرا مفہوم یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہم اصحاب جہل کے اخلاق واطوار پسند نہیں کرتے اور یہ جہل کا دوسرا معنی ہے، جو حلم، وقار اور طمانیت کی ضد ہے۵۰۔

چونکہ یہاں یہ دونوں معنی مراد ہیں اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ 'جہل' مشترک لفظ کے طور پر اپنے دونوں معنی میں استعمال ہوا ہے۔

تلاش وتتبع سے اور بھی بہت سے ایسے الفاظ بآسانی مل جائیں گے جن کے مختلف ومتعدد معانی بیک وقت مراد ہیں یا مراد لیے جانے کی پوری گنجائش موجود ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اس مختصر مقالہ میں اب مزید کی گنجائش نہیں۔ تحقیق مقصد کے لیے یہ چند شواہد کافی ہیں۔

حواشی و مراجع

۱۔ ابو حامد محمد الغزالی، المستصفی فی علم الاصول، الطبعۃ الاولیٰ، دار الکتب بیروت، ۱۴۱۳ھ، ص ۲۶، السید محمد مرتضی الزبیدی، تاج العروس، لجنۃ التراث العربی، ۱۳۸۵ھ/ ۱۹۶۵ء، ۱/۲۳ مابعد

۲۔ جلال الدین السیوطی، الاتقان فی علوم القرآن، دار الکتاب العربی، بیروت، ۲۰۰۴ء/ ۱۴۲۵ھ، ص ۳۴۶

۳۔ زبیدی، تاج العروس، ۱/۲۵

۴۔ محدث عبدالرزاق، مصنف عبدالرزاق، تحقیق حبیب الرحمٰن الاعظمی، الطبعۃ الاولی المجلس العلمی، ۱۹۷۲ء/ ۱۳۹۲ھ، ۱۱/۲۵۵، اس کے الفاظ لاتفقه کل الفقه حتی تری للقرآن وجوها کثیرا ہیں۔ مضمون میں نقل شدہ الفاظ الاتقان کے ہیں۔ دیکھیے الاتقان، ص ۳۴۶

۵۔ سیوطی، الاتقان، ص ۳۴۶

۶۔ ابو النصر اسماعیل بن حماد الجوہری، الصحاح، بیروت ۱۴۲۶ھ/ ۲۰۰۵ء، ۳/۹۲۲

۷۔ ابو منصور محمد بن احمد الازہری، تہذیب اللغه، احیاء التراث العربی ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۱ء، ۱۲/۱۲، جوہری، ۲/۹۲۲، سید محمد مرتضی الزبیدی، ۱۸/۴۷۸

۸۔ الازہری، ۱۲/۱۲؛ تاج العروس، ۱۸/۴۸۵

۹۔ الازہری، حوالہ سابق؛ تاج العروس، ۱۸/۴۷۶

۱۰۔ الازہری، حوالہ سابق؛ تاج العروس، ۱۸/۴۸۳

۱۱۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری، تفسیر طبری، مصطفی البابی، مصر، طبع ثالث ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء، ۱۰/۱۶۶

۱۲۔ قاضی ابو محمد عبدالحق بن عطیہ الاندلسی، المحرر الوجیز، دار الکتب العلمیہ، بیروت، طبع اولیٰ، ۱۴۱۲ھ/ ۱۹۹۳ء، ۳/۵۲

۱۳۔ عبدالرحمٰن بن ناصر السعدی، تیسیر الکریم فی تفسیر کلام المنان، تحقیق الشیخ محمد بن صالح بن العثیمین، موسسۃ الرسالۃ، بیروت ۱۴۲۱ھ، ص ۳۴۱

۱۴۔ تفسیر طبری، ۴/۲۴۱، المحرر الوجیز، ۲/۸؛ الامام عبدالرحمٰن الثعالبی، تفسیر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثعالبی، داراحیاء التراث العربی، بیروت، طبعہ اولیٰ ۱۴۱۸ھ/ ۱۹۹۷ء، ۱۶۶/۲

۱۵ تفسیر طبری، ۲۴۱/۴؛ اسماعیل بن کثیر، تفسیر ابن کثیر، دارالفکر، بیروت، طبعہ اولیٰ ۱۴۰۰ھ/ ۱۹۸۰ء، ۴۵۲/۱

۱۶ ابن کثیر، ۴۵۲/۱

۱۷ تفسیر طبری، ۲۴۱/۴، تفسیر ابن کثیر، ۴۵۲/۱

۱۸ تفسیر طبری، ۲۴۱/۴، تفسیر ابن کثیر، ۴۵۲/۱

۱۹ ابومحمد فراء البغوی، معالم التنزیل بر حاشیہ معانی التنزیل للخازن، طبعہ اولیٰ ۱۳۳۱ھ، ۳۹۹/۱

۲۰ حوالہ سابق

۲۱ زجاج، معانی القرآن و اعرابہ، عالم الکتب، بیروت، طبعہ اولیٰ ۱۴۰۸ھ/ ۱۹۸۸ء، ۱۲/۲

۲۲ تهذیب اللغه، ۴۲/۵؛ تاج العروس، ۴۶۱/۳۰؛ ابن منظور، لسان العرب، دارصادر بیروت، بدون سنہ، ۶۵۰/۱۱ و مابعد

۲۳ ابوحیان الاندلسی، البحر المحیط، دارالفکر، بیروت، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۲ء، ۵۱۱/۳

۲۴ ابوالحسین بن زکریا، معجم مقاییس اللغة، الطبعة الاولیٰ قاہرہ ۱۳۶۹ھ، ۲۱۸/۴ و مابعد؛ تهذیب اللغه، ۱۴۲/۱؛ لسان العرب، ۲۳۴/۱۰

۲۵ تفسیر طبری، ۱۵۱/۱۷ و مابعد، المحرر الوجیز، ۱۹۹/۴ و مابعد، تفسیر ابن کثیر، ۲۱۹/۳

۲۶ حافظ الترمذی، سنن ترمذی، کتاب التفسیر، باب و من سورۃ الحج، حدیث: ۳۱۷۰

۲۷ محمد بن اسماعیل البخاری، صحیح بخاری، کتاب الحج، باب فضل مکہ وبنیانها، حدیث: ۱۵۸۴؛ مسلم بن الحجاج، صحیح مسلم، کتاب الحج، باب نقض الکعبة وبنائها، حدیث: ۳۲۴۳ و مابعد

۲۸ تیسیر الکریم الرحمن، ص ۵۳۶

۲۹ زجاج، معانی القرآن، ۲۸۲/۱ و مابعد، ازہری، تهذیب اللغه، ۴۵۴/۱۵؛ صحاح للجوہری، ۱۵۱۵/۴ و مابعد

۳۰ ان تمام اقوال کے لیے ملاحظہ ہو: تفسیر طبری، ۱۹۱/۱۴ و مابعد؛ البحر المحیط، ص ۶۰۹

۳۱ ایسے کلمات جو متضاد معانی پر دلالت کریں جیسے یہی لفظ ''ضد'' کہ اس کے معنی مخالف اور نظیر و مثیل دونوں کے ہیں۔ ابن الاثیر، النهایه فی غریب الحدیث، ۲۳۶/۳؛

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ازہری، ص ۶۲

۳۲۔ ملاحظہ ہو تہذیب اللغۃ، ۶۲/۱؛ المحرر الوجیز، ۴۴۴/۵

۳۳۔ زجاج، معانی القرآن، ۲۹۲/۵

۳۴۔ راغب اصفہانی، المفردات فی غریب القرآن، مصطفیٰ البابی، مصر، بدون تاریخ، ص ۳۳۸

۳۵۔ تفسیر طبری، ۷۸/۳۰ و مابعد؛ تفسیر ابن کثیر، ۴۸۰/۴

۳۶۔ تفسیر طبری، حوالہ سابق؛ ابن کثیر، حوالہ سابق

۳۷۔ ابن کثیر، ۴۸۰/۴

۳۸۔ قاضی بیضاوی، انوار التنزیل واسرار التاویل، تفسیر سورہ تکویر، دار الجیل، بیروت، بدون تاریخ، ص ۷۸۶؛ تفسیر ابو السعود، الطبعۃ الثانیہ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۰ء، ۱۸/۹؛ آلوسی، روح المعانی، الطبعۃ الاولی، مکتبہ زکریا، دیوبند، ۱۴۲۱ھ/ ۲۰۰۰ء، ۱۰۲/۱۶

۳۹۔ ابن کثیر، حوالہ سابق

۴۰۔ تاج العروس، ۶۸/۱۰ و مابعد؛ صحاح للجوہری، ۵۰۵/۲؛ معجم مقاییس اللغۃ، ۱۲۷/۱ و مابعد؛ تہذیب اللغۃ، ۲۰۸/۱۵ و مابعد

۴۱۔ ان اقوال کے لیے دیکھیے تفسیر ابن جریر، ۵۵/۱۵ و مابعد؛ تفسیر ابن کثیر، ۳۳/۳-۳۴

۴۲۔ تہذیب اللغۃ، ۲۲۵/۱۴؛ لسان العرب، ۱۰۴/۱۴؛ معجم مقاییس اللغہ، ۳۵۱/۱

۴۳۔ انوار التنزیل واسرار التاویل، معروف بہ بیضاوی، سورہ عنکبوت، ص ۵۳۰

۴۴۔ تفسیر ابو السعود، ۲۱۸/۵

۴۵۔ تفسیر ابو السعود، ص ۶۳۲

۴۶۔ تفسیر ابن کثیر، ۱۶۴/۱ و مابعد

۴۷۔ حوالہ مذکور

۴۸۔ حوالہ مذکور

۴۹۔ تفسیر ابن کثیر، ۱۱۸/۱

۵۰۔ معجم مقاییس اللغہ، ۴۸۹/۱

© rasailojaraid.com